

اسلام میں اجتہاد کی اہمیت

پرویز

پچھلے دنوں اسلام آباد میں جو شریعت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں مسلم ممالک کے ممتاز علماء اور فقہانے شرکت کی تھی۔ اس میں زیر بحث موضوعات تو متعدد تھے اور ان پر اہم مقالات بھی پڑھے گئے لیکن اس میں مرکزی خیال یہی تھا کہ اسلامی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یعنی جو قوانین شریعت مروج چلے آ رہے ہیں ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا وہ ابدی طور پر غیر متغیر رہیں گے۔ کانفرنس کی جو کاروائی اخبارات میں شائع ہوئی اس سے مترشح ہوا کہ اس اہم ترین اور بنیادی بحث کے متعلق شرکاء کانفرنس کے ذہن صاف نہیں تھے۔ طلوع اسلام اس موضوع پر مروج سے کھٹا چلا آ رہا ہے۔ کانفرنس کی روداد سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس بنیادی بحث سے متعلق طلوع اسلام میں شائع شدہ اہم مقالات کو پھر سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ان کا آغاز پرویز صاحب کے سٹولر کے ایک خطاب سے کیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ طلوع اسلام میں شائع شدہ مقالات کی حقیقت اخباروں میں شائع شدہ خبروں کی سی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے ہی دن پرانی ہو جاتی ہیں۔ یہ قرآن کریم کے ابدی حقائق پر مشتمل مقالات ہوتے ہیں جن کی اہمیت بدستور باقی رہتی ہے اور انہیں عند الضرورت وقتاً فوقتاً پیش کرنے سے اس اہمیت میں فرق نہیں آتا بلکہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔

قروں کی زندگی میں عبوری دور، بڑا ہی نازک، کشمکش انگیز، اضطراب خیز، شورش آمیز، محروم سکون و مجبور طمانیت بر اکثر و بیشتر یا بس پر در اور صبر رہا ہوتا ہے۔ ”عبوری دور“ سے مراد ہوتا ہے وہ زمانہ جس میں جو کچھ ہو رہا تھا آ رہا ہے، وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور جو کچھ ہونا چاہیے، وہ ہنوز محسوس و مرتب شکل میں سامنے نہ آیا ہو۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی تصویر جرمنی کے شاعر آفاق مخاعر، ریلکے (RILKE) نے، ان حقیقت نگار الفاظ میں، مؤثر ترین انداز سے پیش کی ہے کہ

EACH TORPID TURN OF THE WORLD HAS SUCH
DISINHERITED CHILDREN,
TO WHOM, NO LONGER WHAT HAS BEEN, AND NOT
YET WHAT IS COMING, BELONGS

اپنی تاریخ کی گزر گاہوں پر ایسے مڑے بھی آتے ہیں جہاں زمانے کی حرکت کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے۔ وہاں ہمیں

ایسے محروم المارٹ، بچے نظر آتے ہیں جن کی حواسِ نصیبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو کچھ متواتر چلا آ رہا تھا، وہ ان سے چھپی چکا ہوتا ہے، اور جس نے اس کی جگہ لینی تھی، وہ ہمنواز غمگیر و زنگار میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور آبِ و تاب سے موزوں ہو کر سامنے نہیں آیا ہوتا۔۔۔ یہ، سماں سوختہ اور متنازع بروہِ قیمِ نسل، بیمِ درجہ کے ان دورِ اہول میں عجیب کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

ہماری موجودہ نسل | پاکستان کی موجودہ تعلیم یافتہ نسل، اسی کشمکش میں مبتلا ہے، اور بُری طرح مبتلا۔ چنانچہ جن گھرانوں کا ماضی مذہبی روایات کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے، ان میں اکثر بشرِ اس قسم کی گفتگو سُننے میں آئے گی۔ اس نسل کا جواں سال نمائندہ کہے گا:-

ہم مکرش نہیں ہونا چاہتے۔ ہم تہذیب و اخلاق کی حدود شکنی پسند نہیں کرتے۔ ہم شرافت و نجات کی انسانیت ساز زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چچا جان! آپ سوچئے تو سہی کہ ہم سے مطالبہ کیا کیا جا رہا ہے؟ دنیا ہزاروں سال آگے بڑھ چکی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ زینت کے انداز بدل چکے ہیں، تمدن و معاشرت کی روشیں بدل چکی ہیں۔ زندگی کا ہر نظام — سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، رتی، بین الاقوامی ایک ایک کر کے، نئے قالبوں میں ڈھل چکا ہے۔ نکل کی فرسودہ لڑ میں پالش ہو چکی ہیں۔ سوچ کے طور طریق بدل چکے ہیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو میں تبدیلی آ چکی ہے۔ لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسی انداز کی زندگی بسر کئے جاؤ جس انداز کی زندگی آج سے ہزار سال پہلے بسر کی جاتی تھی۔ تم اپنے اوپر انہی پابندیوں کو عائد کرو جو پابندیاں صدیوں پہلے کے انسانوں پر عائد کی گئی تھیں، تم سوچو تو انہی کے دماغ سے، سمجھو تو انہی کے دل سے، دیکھو۔ تو انہی کی آنکھوں سے، سنو تو انہی کے کانوں سے۔ تم انہی کے متعین کردہ راستوں پر چلتے رہو، انہی کی وضع اور اخبار کردہ روشوں پر گامزن رہو۔ تم ہر نظریہ کو انہی کے پیالوں سے مایہ، ہر عقیدہ کو انہی کی کسوٹی پر پرکھو جسے وہ غلط کہہ چکے ہیں، اسے غلط کہو، جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اسے صحیح سمجھو۔۔۔۔۔ یہ ہے جو ہم سے کہا جا رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ تم بیس چوبیس سال کے جوان ہو چکے ہو لیکن تمہیں وہی جوتا پہنا پڑے گا جو تمہیں دس سال پہلے بنا کر دیا تھا کیونکہ وہ حقیقت ساز اپنے زمانے کا بہترین کارِ بگر تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے پاؤں کتنے ہی بڑھ گئے ہیں اور جوتا اتنے کا اتنا ہی ہے، اس لئے اب وہ فٹ نہیں بیٹھتا تو ہمیں کوسا جانا ہے کہ تم بدقیتر ہو گئے ہو، گستاخ ہو گئے ہو۔ بڑوں کے سامنے بولتے ہو، بزرگوں کا ادب احترام نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم اس کا کیا جواب دیں! ہمیں یہ علامہ اقبالؒ کے اس قسم کے شعر سناتے رہتے ہیں کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا رگ ہے ساز بدلے گئے

لیکن جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ ابا جان! زمانے کے انداز بدلے جا چکے ہیں، اس لئے ہمیں بھی اپنے آئین و ضوابط میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں تاکہ، یہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکیں تو ہمیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ زمانے کے حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں اور اس کے تقاضے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں، یہ آئین و ضوابط ایسے ہی رہیں گے اور ان کی پابندی اسی طرح کرنی ہوگی۔ یہ شریعت کے احکام ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے اسلاف کے فیصلے ہیں جو ہم سے زیادہ سمجھدار تھے اور زمانے کے تقاضوں کو ہم سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ اور پھر وہ بزرگ تقویٰ اور پرہیزگاری میں اس مقام پر تھے کہ جس کی گرد کو بھی تمہارا زمانہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہم ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سوء ادبی ہے۔ یہ زمانہ ہی گستاخوں اور بے ادبوں کا آگیا ہے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی فرمائیے، چچا جان! کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

گھروں کے اندر تو بات یہیں تک پہنچ پاتی ہے، لیکن جب یہ موضوع محراب و منبر سے چھڑتا ہے تو جس قدر شکن آلود پیشانیوں، قہر آمیز نگاہوں اور کھٹ بردہاں سیلابوں کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کو ہدفِ طعن و تشنیع اور نشانہِ سب و شتم بنایا جاتا ہے، اور جس جس قسم کے کفر و الحاد کے جگر پاش فتوؤں اور بے دینی و بے حیائی کے نفرت انگیز القابوں سے انہیں نوازا جاتا ہے، اس سے کون سا کان نا آشنا اور کون سا قلب نامانوس ہے؟ اور اس کے ردِ عمل میں، جب یہ نوجوان کافی ہاؤسوں میں اس سوال کو موضوع گفتگو بناتے ہیں، تو پھر کون سی بھتی ہے جو قدامت پسندوں کے خلاف کسی نہیں جاتی، اور کون سا فقرہ سے جو مذہب پرستوں پر چست نہیں کیا جاتا ہے۔

قوم کی کشتی، افراط و تفریط کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ دریا کی تلاطم خیزیاں، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کے مقہیروں سے کشتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ناخدا جن کے ذمے اس کی حفاظت و سلامتی تھی، اسے بھنور میں چھوڑ کر لب ساحل آرمیدہ ہیں۔ اور نہایت نفع و شوق اور جذب و انہماک سے اس کے ڈوبنے کا تاثر دیکھ رہے ہیں۔ آئیے فرصت کے ان چند لمحات میں ہم دیکھیں کہ اس کشش مکش کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اس کشاکش کا حل کیا؟

پہلے ہم ان نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ انہیں سنبھالنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان ان پڑھ قسم کے عامی ہونے سے کہتے کہ ایک بچہ بیس سال کا چھوڑ چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر سال کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اس کی شکل و شبہات

تعلیم یافتہ طبقہ

اس کے امیال و عواطف، اس کے رجحانات و میلانات، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر عنصر میں تبدیلی آجائے گی،

لیکن ایک حقیقت ایسی ہوگی جس پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک، اٹل اور غیر متبدل رہے گی۔ یعنی یہ کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس حقیقت کو نہ وہ بدل سکتا ہے، نہ زمانے کے تقاضے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا، ہمارے ان نوجوانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے ہر شے میں تبدیلی آجانی چاہیے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ:

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی

میں کیسے اعتبار انقلاب آسمان کروں؟

لیکن چونکہ ہمارا یہ نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے ہم ان سے، ان کی ذہنی سطح پر، ان کی زبان میں گفتگو کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ زمانے کے بدلنے والے تقاضے بجا اور درست، لیکن کیا زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی نہیں جن پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایسی جگہ اٹل اور محکم رہتی ہیں۔ کیا سائنس کے بنیادی قوانین، زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ کیا جیومیٹری کی (PROPOSITIONS) آج بھی وہی نہیں جو آج سے تین ہزار سال پہلے تھیں، جب وہ دریافت ہوئی تھیں۔ کیا ریاضی اور الجبرا کے اساسی اصول، ان ازل تا ابد، غیر متبدل نہیں رہتے۔ کیا حساب کا یہ ابتدائی ساگر کہ دو طاق عددوں (ODD NUMBERS) کی حامل جمع ہمیشہ جفت (EVEN) ہوتی ہے، کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی قابل تغیر و تبدل ہو سکتا ہے! لہذا، یہ مطالبہ کہ زمانے کے حالات کے بدل جانے سے، ہر شے میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیے، دنیا کے علم و حضارت میں قابل تسلیم قرار نہیں پاسکتا۔ زمانے کے تقاضے لاکھ بدلیں، ناقابل تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابل تغیر رہیں گی۔

اور دوسری طرف ہم اپنے قدامت پرست بزرگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ زندگی بقا کے لئے غذا کی ضرورت لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں نہ نوع انسانی کی پوری تاریخ میں کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں اس میں استثناء پایا گیا ہے۔ یہ زندگی کا غیر متبدل قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ تفصیل کہ آپ کس قسم کی غذا کھاتے ہیں، کس طریق سے کھاتے ہیں، کن کن اوقات میں کھاتے ہیں، ایسی ہیں جن میں ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جسے کہ ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آپ کی بچپن کے زمانے کی غذا اور بھتی، جوانی کی اور، اور بڑھاپے کی، ان دونوں سے مختلف۔ تندرستی کے زمانے میں غذا اور ہوتی ہے، بیماری کے دنوں میں اور۔ سردی میں اور قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے۔ گرمی میں اور قسم کی۔ کلیہ غیر متبدل ہے لیکن اس کی علی جزئیات میں، حالات کے بدلنے سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان مہیدی تصریحات کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کیا چیزیں غیر متبدل ہوتی ہیں اور کونسی ایسی، جن میں حالات کے مطابق تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ یہ سوال صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس

سے ہماری قدیم اور جدید نسل میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت کی، اس کے علاوہ، ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ بنیادی ہے۔ اسے غور سے سنئے۔

اس مطالبہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں، لیکن اس کے باوجود، اس تیس سال کے عرصہ میں، ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک عملی قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک یہ بنیادی سوال طے نہیں پاسکا کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں۔

اس میں کون کون سے اجزاء غیر متبدل ہیں اور کون کون سے ایسے جن میں، بہ تغیر حالات تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ متنبہ کیٹی

پاکستان میں بنیادی سوال

میں یہ سوال اٹھایا گیا تو علماء حضرات نے کہا کہ اسلام میں، مکمل ضابطہ قوانین پہلے سے موجود ہے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے، نہ کسی تبدیلی کی اجازت۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ضابطہ قوانین کو مدن و عن نافذ کر دے اور اگر کسی مسئلہ کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ دوسری طرف، ارباب بست و کشاد، جن کے سر پر ملکی قوانین کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، یہ محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر، علماء کے پیش کردہ ضابطہ قوانین کو مدن و عن نافذ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ان کی کمزوری تھی یا تقاضائے مصلحت کہ وہ جس حقیقت کو محسوس کرتے تھے اُسے کھلے کھلے الفاظ میں زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، ہر ایک نے اسی میں عاقبت سمجھی کہ دستور میں تو یہ شق لکھ دی جائے کہ ملک کے قوانین اسلامی یعنی کتاب و سنت کے مطابق۔۔۔۔۔۔ ہوں گے لیکن اس سے آگے کسی نے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ یہ سوال کسی نہ کسی طرح ٹھٹھا چلا جائے۔ دوسری طرف علماء حضرات بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں تو ایک طرف، دنیا کے اسلام میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں۔ نہ ہی فرقوں کی موجودگی میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی عاقبت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ سوال عملاً سامنے آئے ہی نہیں۔ میرا تعلق، نہ ارباب حکومت سے ہے نہ اہلائے شریعت سے۔۔۔۔۔۔ اقبال کے الفاظ میں، میں سچ

نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آئے، قرآن کی بارگاہ سے پوچھوں کہ اس کا حل کیا ہے۔ قرآن کریم پر غور و تدبر سے، اس اہم ترین اور (بظاہر) مشکل ترین مسئلہ کا حل، میری بصیرت کے مطابق مجھے مل سکا ہے۔ اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت ہماری قوم اس (Mod) ہی میں نہیں کہ کسی مسئلہ پر

سفیدگی سے غور کر سکے۔ اس کے باوجود، میں اس سوال کو سامنے لا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید اس کے بعد ہمارا نصیب یاوری کرے اور قوم اس قسم کے بنیادی مسائل حیات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کرے، تو میری قرآنی فکر کے یہ نتائج اس کے کسی کام آسکیں۔ ورنہ اس وقت تو یہ مثال یہ سری کو شمش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خن آشیاں کیلئے

(۵)

انسان کو جب اس دنیا میں بسایا گیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تمہیں آسمانی راہ نمائی ملتی رہے گی۔ وَمَنْ يَتَّبِعْ هَذَا سَبِيلًا لَّاتُخِذْ لَهُمْ دُولًا عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲۱۳) جو اس راہ نمائی کا اتباع کرے گا وہ بلا خوف و خطر اور بے حزن و ملال منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس راہ نمائی کے لئے پروگرام تو یہی تھا کہ زندگی کے بنیادی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو وحی کی روش سے دیا جائے اور اس بات کو ہر دور کے انسانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی طریق کار خود وضع کریں۔ لیکن شروع شروع میں انسانی عقل و شعور خام اور اس کا تجربہ ناپختہ تھا، اس لئے ان اصولوں کی بیشتر جزئیات بھی خود وحی کی روش سے متعین کر دی جاتی تھیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وہ اپنے واسے سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتی بنائیں، تو کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کی روش سے بتایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ: وَصْنِعِ الْفُلَکَ یَا عِیْسٰی نَا وَحِیْنَا۔ (۲۱۴) ”تم ہماری زیر نگرانی، ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔“ اس طرح ایک رسول، غیر متبدل اصول و ضوابط اور اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، جزئیات و تفصیل اپنی امت کو دے کر چلا جاتا۔ لیکن اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوتا یہ کہ اس کے نام لیوا، مذہبی پیشوا، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے، اس کی وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے اور کہیں وہ دست برد زمانہ سے ویسے ہی تلف ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور رسول آ جاتا اور ایک جدید ضابطہ حیات بذریعہ وحی دے دیتا۔ اس میں غیر متبدل اصول تو وہی ہوتے، جو سابقہ رسول کی وحی میں تھے لیکن جزئی احکام کا اندر نو جائزہ لیا جاتا۔ ان میں جو احکام ایسے ہوتے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جاتا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور عند الضرورت ان میں اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ یہی وہ نظام وحی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: مَا نَنْسَخْ مِنْ آیٰةٍ أَوْ نَنْسِيْهَا أَوْ بَدَّلْنَاهَا بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا۔ (۲۱۵) جو سابقہ حکم ہم منسوخ کر دیتے تھے اس کی جگہ اس سے بہتر حکم نازل کر دیتے تھے۔ اور جو احکام ایسے تھے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی میسک انہیں فراموش کر دیا گیا تھا، ان کی دوبارہ

طا اور اب تو حالت اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز ہے۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا، لکنہ تاریخ انسانیت میں اس دور کا آغاز ہو گیا جس میں ذہنی انسانی نے بلوغت تک پہنچ جانا تھا۔ اسکی علمی اور فکری صلاحیتوں میں پختگی آجانی تھی۔ اس تجربہ اور مشاہدہ کے میدان، افق تا افق پھیلنے چلے جانے لگے۔ تو اس وقت نوع انسان کو وحی کی رو سے آخری ضابطہ حیات عطا کیا گیا جسے قرآن کریم کہا جاتا

آخری ضابطہ حیات

اہل کتاب کا اعتراض

اہل کتاب کا اعتراض

رسول اللہ ﷺ پیش کرتے ہیں، وہی ہے جو انبیائے سابقہ کو دیا گیا تھا تو قرآن کے بعض احکام، اُن کے ہاں کے احکام سے مختلف کیوں ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ اَوَّلِ تَوْحِيدِ لَہٗ اِنِّیْ رَسُوْلٌ کَیْ مَّا کَرَدَہٗ ضَایِطَہٗ اِہٖ اَبَیْتُ مِیْنِ تَحْرِیْفِ کَرَدِیْ اَوْر دوسرے یہ کہ ان جزئی احکام میں تبدیلی ضروری ہے۔ اَللّٰہِیْنَ، ناقابلِ تغیر اصولوں کا نام ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کا تنازعہ نہیں کیا جاسکتا۔ **یٰۤاَمَّۃٌ جَعَلْنَا مَثَلًا لِّہٖمْ۔ نَاسِکُوْۤہٗ۔ فَلَا یُنَازِعُہٗ فِیْ الْاَمْرِ۔ (۲۲۶)** اس سے واضح ہے کہ الامر غیر متبدل اصولِ دین ہے، اور بدلتے رہنے والے احکام، مناسک و مناسک۔ انہی اصولوں کو، جو آخری مرتبہ قرآن میں دیئے گئے تھے، مکمل بھی کہا گیا اور غیر متبدل بھی۔ **وَرَسَمْتُ لَکُمُ الْکَلِمَۃَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدَلَ لِّیْکَلِمَۃِہٖ۔ (۲۲۶)** تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہیں قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَكَلِّمُ الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (۵۱) ”تم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باب نبوت ہمیشہ سکے نئے بند ہو گیا۔

قرآن کریم کا یہ حصہ دین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو اس میں مذکور ہیں، وہ بھی کم و بیش اصولی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر حکم، خاص شرائط سے مشروط ہوتا ہے۔ اور اسے خاص حالات کے تحت نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا گیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔ (مثلاً) اس میں سرفتہ (چوری) کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سرفتہ کی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ اس لئے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔ اس نے ان کا تعین انہماؤں پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں اور نہ ہی شرائط غیر متبدل ہو سکتی ہیں۔

یہ ہیں وہ اصول و اقدار اور احکام و ضوابط جو قرآن میں مذکور ہیں۔ انہی کے مجموعہ کا نام ”الدین“ ہے۔ جن امور کے متعلق قرآن خاموش ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تعلق دین سے نہیں۔ ان کے متعلق اس نے مسلمانوں سے تاکید اکہد دیا کہ ان کی بابت خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ اگر ان کا تعلق دین سے ہوتا تو انہیں ہم خود ہی بتا دیتے۔ سورۃ بآئہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَمَّا أَشْتَاتَ إِن تَبَدَّلَ لَكُمْ تَسْوُكُمْ۔ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدَّلَ لَكُمْ۔

اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق زبانِ وحی خاموش رہی ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات مت کرو۔ ابھی نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے سوالات کے جواب میں اگر وحی کی رو سے کچھ مزید احکام دے دیے گئے تو وہ تمہیں ناگوار گزر رہے گے۔ سو تم مفت میں بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كُفْرِينَ۔ (۵۲) ”تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عاید کر کے زندگی کو ناقابل برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہی ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایت دینا بھول گئے ہیں۔ ہم دانستہ خاموش رہے ہیں کہ ان امور کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے سلسلہ میں کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔ اس آئے جلیلہ کی تشریح حضور نبی اکرم نے

نے ایک حدیث میں یوں فرمائی ہے کہ: **إِنَّ اللَّهَ صَوَّضَ قَوْلَیْنِ فَلَا تُضَيِّعُوهُمَا - وَحَرَّمَ حُرْمَاتٍ فَلَا تَنْتَهَكُوهُمَا - وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوا حَا وَ سَكَتَ عَنْ أَشْيَاءٍ مِّنْ غَیْرِیْنِیَّانِ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا**۔ اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں قائم مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کرید مت کرو یا درکھو! جن باتوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے، اس نے داف (معاذ اللہ) بھول گیا ہے۔ (مشکوٰۃ: باب تمسک بكتاب وسنت) میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

حاصل بحث | لہذا کتاب بالا سے واضح ہے کہ ختم نبوت کے بعد انسانی راہ نمائی کی صورت یہ قرار پائی کہ:-

۱۔ جن امور کے متعلق قرآن کریم نے اصولی راہ نمائی دی ہے، جماعت مومنین، یعنی اسلامی مملکت، اُمت کے مشورہ سے، اپنے حالات کے مطابق، یہ خود طے کرے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

۲۔ جہاں تک احکام قرآنی کا تعلق ہے، اسلامی مملکت ان مواقع، حالات اور شرائط کا تعین کرے جن کے مطابق انہیں نافذ کیا جائیگا۔

۳۔ اسلامی مملکت اس امر کا بھی فیصلہ کرے کہ قوم کے موجودہ حالات کیا ہیں، اور قرآنی اصول و احکام کو کس طرح نافذ کیا جائے کہ وہ تدریجاً آہستہ آہستہ، آخری منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی نصب العین تو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اس نصب العین تک تدریجاً پہنچنے کیلئے عملی پروگرام حالات کے تقاضا کے مطابق، خود وضع کرے۔ کسی قوم کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے، اصولی تدریج و اہمال کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی، نزول وحی میں اس اصول کو پیش نظر رکھا

اصول تدریج

تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے کہ:-

پہلے مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے (یعنی ترغیب و ترہیب سے متعلق آیات)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے، تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب نہ پینے کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے بھی انکار کر دیتے۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

زنا سے غالباً مراد ہیں نکاح کے وہ طریقے جو عربوں کے ہاں رائج تھے۔ لیکن جنہیں قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ امتناع شراب کے احکام میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا وہ اس باب فکر و نظر کے لئے بڑی

بصیرت افروز ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی گھٹی میں شراب پڑ چکی ہو، جو نسل بعد نسل اس کی عادی چلی آ رہی ہو۔ کیف و مستی جس کے خون کے ذرات میں جلول کر چکے ہوں، اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک نکتہ شراب چھوڑ دے۔ وہ اسے بند ریج ہی چھوڑ سکے گی۔ اسی حکمت کے پیش نظر قرآن کریم میں پہلے یہ آیا کہ خمر و میسرہ میں فوار بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن ان کے نقصان، ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ (۲/۱۶۹)۔ پھر یہ کہا گیا کہ: لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۲/۲۳۸)۔ تم نشہ کی حالت میں اجتماعات صلوٰۃ میں شریک نہ ہو کرو، اور اس کے بعد تیسری منزل میں، اس کی قطعی ممانعت کی گئی۔ (۲/۲۱۹)۔ یہ ممانعت مدینہ میں آ کر سولہ۔ اسی طرح قرآن کریم کے دیگر احکام پر نگاہ ڈالیں۔ نظر آجائے گا کہ اس نے اپنی اولین مخاطب قوم کی معاشرتی اور تمدنی سطح، اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے رکھ کر، ان احکام کو اس طرح بند ریج نازل کیا کہ وہ قوم تیس سال کے عرصہ میں، اس پروگرام کے نقطہ اول میں سے آہستہ آہستہ آخری منزل تک لے جاتی گئی۔ جن سطح پر نگاہوں کے سامنے یہ بنیادی حقیقت نہیں، انہیں قرآنی احکام میں جا بجا تضاد نظر آئے گا۔ حالانکہ قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ: وَتَوَكَّلْ عَلَىٰ عِزِّ اللَّهِ (۲/۲۰۰)۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت سے اختلاف پاتے۔ تضادات کے اسی غلط تصور نے یہ عقیدہ وضع کرا دیا کہ قرآن کی بعض آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر اہل ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ ناسخ و منسوخ کا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ اس کے احکام احوال و ظروف سے مشروط ہیں اور ان کا اطلاق موقع و محل کے مطابق ہوتا ہے۔ تدبر فی القرآن سے مراد یہ ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے جو حالات اس وقت ہیں، ان میں قرآن کا کونسا حکم نافذ العمل ہونا چاہیے، اور کون کونسی شرائط سے مشروط اور کس کس قسم کی قبو و سے مقید۔ یہ شرائط و قید، قرآن کریم کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں، حالات کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ یہ کام اسلامی حکمت کے کرنے کا ہے، مذکورہ افراد یا نجی اداروں کا۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

(۰)

قرآنی راہ نمائی کے مطابق سب سے پہلی مملکت، نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ: وَبَشِّرْهُمْ فِي الْآخِرَةِ (۲۳/۱۰۰) معاملات میں، اذیہ امت (یعنی اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن کریم کے احکام اور اصول و اقدار سب منزل من اللہ تھے۔ ان میں خود رسولؐ اللہ کے ذاتی خیالات و افکار کا بھی کوئی دخل نہیں تھا چاہے جانشین کے اس سلسلہ میں دوسروں سے مشورہ لیا جاتا۔ جو کچھ مشاورت سے طے کیا جانا مقصود تھا وہ بھی تھا کہ جو حالات اس وقت درپیش ہیں، ان کی روشنی میں، قرآنی اصولوں

پہلی اسلامی مملکت

کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کے جزئی ضوابط مرتب کئے جائیں، اور جو احکام قرآن میں آئے ہیں انہیں کوئی شرائط و حدود کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ ان امور کے فیصلے، باہمی مشورہ سے ملے پاتے تھے۔ اور (ظاہر ہے کہ) ان فیصلوں میں حالات کے مطابق حکم و اضافہ اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ جو یہیں کتب احادیث میں، ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ درحقیقت مختلف اوقات میں ملے کر وہ مختلف فیصلے ہیں۔ ہماری کتب روایات میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں فیصلے تو دیئے گئے ہیں لیکن ان احوال و ظروف کی تفصیل و تصریح نہیں دی گئی جن کی روشنی میں وہ فیصلے دیئے گئے تھے۔ قانون دان حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کسی فیصلے کے صحیح مفہوم و منطوق تک پہنچنے کے لئے (CASE LAW) کا سامنے ہونا کتنا ضروری ہے۔ اُمت میں جو اس قدر فرقے پائے جاتے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ کے کسی ایک فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے نے کسی دوسرے فیصلے پر۔ اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ سمجھ لیا کہ جس فیصلہ پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ابدی قانونِ شریعت ہے، حالانکہ ان میں ابدی قانون کوئی بھی نہ تھا۔ یہ، مختلف احوال و کوائف کے ماتحت، صادر فرمودہ فیصلے تھے، جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک غلط مثال پر غور فرمائیے۔

قرآن کریم کی روش سے، زمین (یا وسائل پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ اُمت کی مشرکہ تخیل میں رہتی ہے، اور مملکت اس کا انتظام کرتی ہے تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں مختلف اوقات میں مختلف اراضیات مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ آپؐ نے مفاد عامہ کے پیش نظر، حالات کے تقاضے کے مطابق، ان کے متعلق مختلف انتظامات فرمائے۔ مثلاً خیبر فتح ہونے پر، زمین کو مملکت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس میں سے کچھ حصہ فوجیوں کو دے دیا اور بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور پیداوار میں حکومت اور اصل باشندوں، دونوں کو شریک کر لیا۔ وادیِ القرئی کی کل زمین آپؐ نے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی۔ اس کے برعکس، بنو نضیر، جو جاہلِ دار اور زمین چھوڑ گئے، آپؐ نے اُسے مملکت کے زیر انتظام، مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد تمام زمینیں خلافت کے زیرِ اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں۔ ان تصریحات سے آپؐ نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اصول (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی) تو اپنی جگہ پر اُٹل اور خیرِ متبادل رہا، لیکن زمین کا انتظام، موقع اور محل کے لحاظ سے بدلا جاتا رہا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا کیا انتظام کیا)۔

اسی طرح جرائم کی سزا کے سلسلہ میں بھی آپؐ نے مجرموں کے احوال و کوائف اور ان کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر مختلف اوقات میں مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ مثلاً ایک شخص نے شراب پی اور اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ آپؐ نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ

کیا تم نے ہمارے ساتھ غار پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تمہارا جرم معاف کر دیا ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے توبہ کر لی۔ یہ تھا اس میں اصلاح کا امکان جس کے پیش نظر حضورؐ نے اس پر تعزیر وارد نہیں کی۔ ایک واقعہ میں اصل مجرم کی جگہ غیر مجرم پکڑا گیا اور قانون کے مطابق حضورؐ نے اس کو سزا کا حکم بھی سنادیا۔ لیکن بعد میں اصل مجرم نے آکر کہا کہ مجرم وہ نہیں۔ میں ہوں۔ اس پر آپؐ نے دونوں کی سزا معاف فرمادی۔ پہلے کی اس لئے کہ وہ مجرم نہیں تھا، اور دوسرے کی یہ کہہ کر کہ اس نے ایک بے گناہ کو سزا سے بچانے کے لئے، اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ اس سے اس نے ایسی بلندی کر دار کا ثبوت دیا ہے کہ وہ معافی کا مستحق ہو گیا ہے۔ (نسائی) اس قسم کی اکثر مثالیں حضورؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں میں ملتی ہیں۔ ایسے فیصلے کرتے وقت قوم کے عمومی جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیر نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے اسے ابراہیمؑ خطوط کے مطابق تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا کے ہتھکڑیاں آپؐ نے فرمایا کہ:-

اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس میں ابراہیمؑ پر اس کی تعمیر کرتا۔ اور حطیم کو اس کے اندر شامل نہ لیتا۔
(مسلم باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ دین کے اصول و اقدار کو ہمیشہ غیر متبدل رکھتے تھے لیکن ان کی روشنی میں مختلف امور کے فیصلے کرتے وقت مصالح عمومی، افراد کے احوال و کوائف اور قوم کے امیال و عواطف کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح، مختلف اوقات میں طریق کار کا بھی اختلاف ہوتا تھا۔ مثلاً عدل، قرآن کا بنیادی اصول ہے، جس میں کسی صورت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدل کو بروئے کار لانے کا طریقہ مختلف اوقات میں مختلف ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:-

شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔
(الطریق الحکمیہ)

لہذا، دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جائے، اس کے لئے قرآن کی سند یا رسول اللہؐ سے ثبوت ضروری نہیں۔ طریق کار حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ بشرط یہ ہے کہ وہ طریق کار قرآنی اقدار سے نہ ٹکرائے۔ خود حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریق کار اختیار فرمائے تھے۔

خلافت راشدہ

حضور نبی اکرمؐ نے اسلامی مملکت کو قائم فرمایا اور عملاً بنا دیا کہ اس میں ثبات و تغیر کا امتزاج کس طرح سے ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور مملکت کا نظام خلافت راشدہ کی تحویل میں آ گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا زمانہ خلافت بہت مختصر تھا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مملکت کی حدود بہت پھیل گئیں۔ نئی نئی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ مختلف تہذیبوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ مندرجہ انداز کے تمدن سامنے آئے۔ کاروبار مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس سے نئے مسائل ابھرے جن کا حل کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ :-

بے شک خدائے بزرگ و برتر، حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے

(کتاب المیزان)

نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔

ان نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے نئے فیصلے کئے جاتے۔ جو معاملات پہلی بار سامنے آئے اور ان کے متعلق جو فیصلے کئے گئے، انہیں مؤرخین نے، اولیاتِ عمرؓ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ جن امور کے فیصلے عہدِ رسالتِ مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے زمانے میں ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں بھی تغیر و تبدل کیا۔ یہی وہ گوشہ شدہ ہے جو ہمارے موضوعِ بحث نظر کی رو سے، قابلِ غور ہے۔ ایسے فیصلوں کی تعداد بھی کثیر ہے لیکن قلتِ وقت کی بنا پر، ان میں سے چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت میرا مقصود تاریخی استنباط نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلامی نظام میں ناقابلِ تغیر، قرآنِ کریم کے اصول و اقدار ہوتے ہیں، اور ان کی روشنی میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ حالات کے تغیر سے، بدلے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآنِ کریم کے احکام کا نفاذ بھی موقع اور محل کی رعایت سے، مناسب شرائط سے، مشروط ہوتا ہے۔ وہ مثالیں جن کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

حضرت عمرؓ کے فیصلے

(۱) قرآنِ کریم میں مسلمان مردوں کو، اہل کتاب کی عورتوں سے

شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عہدِ رسالتِ مآبؐ اور خلافت

صدیقیؓ میں اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ عورتیں امت میں فتنہ برپا کرنے کا موجب بن جائیں گی۔

(احکام القرآن)۔ (ابو بکر جصاص)۔ نیز کتاب الآثار، امام محمد (

(۲)۔ اسی طرح، قرآنِ کریم میں اہل کتاب کے طعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے

حکم دیا کہ مسلمانوں کے شہروں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ذبیحہ خانے ہٹا دیئے جائیں اور

اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم اپنے انتظام کی بنا پر ان سے مستغنی ہو گئے ہیں۔ (المدوۃ، کتاب الذبائح)

(۳) قرآن کریم میں صدقات کے مال میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ، اپنے سابقہ معاشرہ سے کٹ کر، اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں اور اس سے انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، تو اس مدد سے ان کی امداد کی جائے۔ رسول اللہ اور حضرت ابو بکر کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب ملک میں ایسی خوشحالی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کیلئے الگ امداد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (احکام القرآن - جصاص)

(۴) رسول اللہ کے زمانے میں شرابی کو معمولی سی سزا دی جاتی تھی جس سے وہ اپنے کئے پر نادم ہو جاتا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔ (سنن الکبریٰ)

(۵) قرآن کریم کی رو سے، سرقہ (چوری) کی سزا "قطع یہ" ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قطع کے زمانے میں اس سزا کو موقوف کر دیا۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر اضطراری حالت میں چوری کر لیتا تو اسے سزا نہ دی جاتی۔ ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کا مالک انہیں بھوکا رکھتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجبور ہو کر اہم کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چوروں کو تو معاف کر دیا اور اونٹ کے مالک کو، ان غلاموں کے مالک سے یہ کہہ کر تاوان دلایا کہ اس جرم کے مرتکب درحقیقت تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکے رکھ کر انہیں چوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ (آپ کا یہ فیصلہ، اسلامی نظام معیشت میں بڑی اصولی اہمیت رکھتا ہے)۔

(۶) رسول اللہؐ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جاسکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین سے گزرے۔ اور وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو۔ (الخروج - یحییٰ)

(۷) اس سلسلہ میں عہد فاروق کا سب سے اہم فیصلہ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ اسے ملکیت کی تجویز میں رہنا چاہیے۔ رسول اللہ کے زمانے میں اراضیات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلمانوں کے قبضے میں آتے تھے جنہیں اموال غنیمت کے طور پر، بالعموم فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کے متعلق رسول اللہؐ نے بھی مختلف انتظامی طریق اختیار فرمائے تھے۔ جب عراق اور

حد کوڑے کس قسم کے ہوتے تھے اس کے متعلق طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۷ء ملاحظہ فرمائیے۔

شام کے علاقے فتح پور تھے، تو ایک تودہ رقبے بڑے وسیع و عریض تھے، اور دوسرے اولوں کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں۔ صحابہؓ کی اکثریت کی رائے تھی کہ انہیں، مال غنیمت کے طور پر فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سے متفق نہیں تھے۔ یہ معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اعیانِ اُمت کی عام میٹنگ میں پیش کرنا پڑا۔ اس میں مختلف حضرات نے جو تقاریر کیں، تاریخ کے اوراق نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اور وہ اس موضوع کے سمجھنے میں بڑی مفید ہیں۔ ان کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے، اور نسلِ بعد نسل اسی میں منتقل ہوتی رہے؟ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور محتاجوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی خدشہ ہے کہ لوگ پانی کی باریوں پر بھی فساد کرنے لگ جائیں گے۔

(لہذا، میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا)۔

پہلی میٹنگ میں فیصلہ نہ ہو سکا تو اسے دوسری میٹنگ میں زیر بحث لایا گیا۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ رسول اللہؐ نے اراضیات کو فوجیوں میں تقسیم فرمایا تھا اس لئے ہمیں بھی ویسے ہی کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بڑی مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی۔ جس میں، علاوہ دیگر دلائل و شواہد، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ مال فتنے میں مہاجرین اور انصار کا بھی حصہ ہے۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ - (۵۹) اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس میں آنے والی نسلوں کا حصہ نہیں رہ سکتا اس لئے اسے مملکت کی تحویل ہی میں رہنا چاہیے۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز اور حقیقت کشا تھی کہ تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب - شاہکار رسالت - باب معاشی نظام)۔

ان تاریخی شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اگر حالات متقاضی ہوں تو اسلامی نظام کی رو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حک و امانہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، وہ اباب فکر و فکر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں

ہمارے سامنے، ملت اسلامیہ کے منتقین اعظم، امام ابوحنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی

قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبیر کا تعلق ہے، امام صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبیر کی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآن کریم اور فکر انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبیر سے خود دریافت کرنا چاہیے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفکر سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو قیاس قرار دے کر، اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ: اول من قاس ابلیس۔ فلا نفسوس۔ سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ لہذا، ہم ایسا نہ کرو۔ اس کے جواب میں امام صاحب فرماتے تھے کہ

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں۔ وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ہے کہ

مَا خَلَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۱۳۰) ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہذا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہم قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔ (کتاب میزان)

امام صاحب اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآن کریم سے استنباط مسائل کرتے تھے، اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو، نظائر (PRECEDENTS) سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں، استفادہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں من و عن نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہد رسالتؐ اور خلافت راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحبؒ کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفراء نے یہ قول نقل کیا ہے کہ:- ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (اپنی دونوں ہم عمر ہوتے) تو آپ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۲۹)

دوسرے مقام پر ہے:-

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہؐ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابواسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے

اکثر نبی کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔ (ایضاً - ص ۲۸۷)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بعد آدمی نے لکھا ہے کہ ابو حنیفہؒ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا جھوٹا چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم بتو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلوری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً - ص ۲۹)

امام صاحبؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ اور اسی کی خاطر میں نے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ مجھے شک ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور ذخیرہ استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر مبنی و عین نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

(خطبات - تشکیل جدید - چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے

کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

ان حالات کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مفسر یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات - ص ۱۶۳-۱۶۴)

یہ تھا امام ابو حنیفہ کا مسلک جو عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک ابھری جس کی رو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے،

اس کے خلاف تحریک

اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ وہ عین دینی ہے اور اس میں تغیر و تبدل الحاد و بے دینی جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور و فکر (جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہد رسالت میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافت راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ اُمت کے لئے دائم، ناقابلِ تغیر و تبدل، ضابطہ قوانین قرار پائے۔ اس تحریک کے پُرچوش محرک امام شافعی نظر آتے ہیں۔ انہی نے یہ عقیدہ عام کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں — ایک وحی متلو اور دوسری وحی غیر متلو — یہ دونوں، خدا کی طرف سے، بواسطہ حضرت جبریل نازل ہوئی تھیں۔ وحی متلو قرآن کے اندر درج کر دی گئی اور وحی غیر متلو، احادیث کہلائی۔ لہذا، رسول اللہ کو خدا کی طرف سے قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ مثلاً محمّد - قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل، دوسری وحی بھی دی گئی جو احادیث میں منضبط ہے۔ اس عقیدہ کی اہمیت کے پیش نظر، احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے، حالانکہ نہ رسول اللہ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر اُمت کو دیا تھا اور نہ ہی خلافت راشدہ میں ایسا ہوا تھا۔ احادیث کا پہلا مبسوط مجموعہ، جسے صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے، امام بخاری نے تیسری صدی ہجری میں مرتب کیا تھا۔ اور وہ بھی بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر احادیث کے تمام مجموعے اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو فیصلہ حدیث کی رو سے کیا جائے گا۔ قرآن کی رو سے — اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھے تو یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

حدیث کی اس پوزیشن کی رو سے، جو کچھ احادیث کے مختلف مجموعوں میں آگیا اور جسے صحیح قرار دے دیا گیا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا گیا۔ یہی عقیدہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا مدافع، امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے، غیر متبدل احکام شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہرائے ہوئے ہماری روح پر پکپی چھا جاتی ہے۔ امام مالکؒ بن انس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلتس کے فتنہ سے کم نہیں۔ عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے دقبال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے۔ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو ٹوڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بد بخت پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کالفاظ استعمال کیا ہے۔ ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اس قسم کے فتادی کی وجہ سے، امام صاحبؒ کے خلاف جذبہٴ مسافرت اس حد تک شدید ہو گیا کہ ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں، تو اسودؒ نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ یہ تمام تصریحات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں موجود ہیں اور ادارہ طابع اسلام کی طرہ سے شائع کردہ کتاب، مقام حدیث میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

امام اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین، لوگوں کو یہ کہہ کر بخٹھراتے تھے کہ یہ لوگ منکرین حدیث اور منکرین شان رسالت ہیں، اس لئے انہیں اس سیلاب بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں، وہ ناقابل تغیر ہیں، اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید، احادیث سے شروع کر دی۔ لوں خود فقہ حنفی کے فیصلے غیر متبدل قرار پا گئے اور ان پر اجتہاد کے راستے بند ہونے شروع ہو گئے۔

رفتہ رفتہ، یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابل

تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک پیشوا اور مسلم امام، ابوالحسن عبید اللہ انکرفی کا قول ہے کہ ”ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماقول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ ماقول یا منسوخ ہے۔“ (تاریخ فقہ اسلامی - علامہ خضریٰ - ص ۲۱۲) ظاہر ہے

کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف، یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چند سال ادھر کا ذکر ہے، (جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد نقوی نے ایک استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدٰی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہذا اگر تحقیقات اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں، تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمت محمدیہ کا اجماع ہے۔ (بحوالہ، ایضاً۔ مہر اگست ۱۹۶۸ء)

حالانکہ ان کے سامنے، خود امام اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں، کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو۔ اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحبؒ فیصلے فرماتے ہم انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحبؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔ (خطیب بغدادی۔ جلد ۱۵ء۔ ص ۲۵۷) یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں، اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔

بہر حال، میں کہہ رہا تھا کہ جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی، امام ابوحنیفہؒ ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتے تھے، ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے لیا۔ اور اس طرح اُمت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چل آ رہی ہے۔

عقل و فکر مفلوج ہو گئے | نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں، جنہیں قرآن کریم نے وجہ شرف انسانیت قرار دیا ہے، پیچھے

شل اور پھر رنستہ رنستہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ مسلمان اصولی طور پر دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک اہل حدیث اور دوسرے اہل فقہ۔ اہل حدیث کے نزدیک، علم دین سے مراد فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جو بات سامنے آئے، یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارے میں کتبِ روایات میں کیا آیا ہے۔ اور اہل فقہ کے

نزدیک یہ کہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ حوالے پیش کر سکے وہ اتنا ہی بڑا عالم تصور کیا جائے گا۔ اسلامی زندگی سے مقصد وہ قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرمو انحراف یا تجاوز کیا اور ارباب شریعت کی بارگاہوں سے کفر و الحاد کے فتوؤں کی بوجھار شروع ہو گئی۔ اسلاف کی تقلید میں کس درجہ شدت اختیار کی گئی، اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ اموی دور حکومت میں، دمشق میں سب سے بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے بعد دیگر مساجد اس کے رخ پر بنائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد، مسلمان انجیڑوں نے حسابی قاعدہ کی رو سے دیکھا کہ جامع دمشق کا رخ کعبہ کی صحیح سمت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں صفوں کا رخ بدل دیا جائے اور آئندہ مساجد صحیح سمت کے مطابق تعمیر کی جائیں۔ مسئلہ ارباب شریعت کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جامع دمشق کا رخ جانب قبلہ نہیں تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف نے جس قدر نمازیں پڑھیں وہ درست نہیں تھیں۔ ہم چند انجیڑوں کی بات پر، اپنے اسلاف کی شان میں اس قدر سودا دلی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان مساجد کا رخ تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح وہی ہے جو اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ بحلی خیر فی اتباع السلف۔ نیکی اور بھلائی بہ تمام و کمال اسلاف کے اتباع میں ہے۔ (بحوالہ شافعی) چنانچہ مساجد کا رخ نہیں بدلا گیا۔ اور یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے جس کا خدا، کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں اور دلائل و براہین کی روش سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار کر دیتے ہیں کہ: **اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ اٰثَرِهِمْ مَّسْجُودًا** (۳۲) ہم نے اپنے آباؤ و اجداد کو

تقلید کی شدت

ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہیں کے نقوش قدم پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ **وَ اِذَا قِيلَ لَهُمْ اَتَّبِعُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا غُلَامًا** (۳۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ: **اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ بِدْعًا عَرُوْهُمُ اِلٰى عَذَابِ السَّعٰبِ** (۳۱) خواہ شیطان انہیں جہنم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

تقلید اور قرآن

اس کے جواب میں ہمارے ارباب شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز نہیں تھی۔

اس کے جواب میں ہمارے ارباب شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز

نہیں قرار پاسکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علت پر غور نہیں کرتے جس کی بنا پر تقلیدِ اسلاف سے روکا گیا ہے، وہ علت یہ ہے کہ خدا جب **مَا أَنْزَلَ اللَّهُ** کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ **مَا أَنْزَلَ اللَّهُ** کی رہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلاف کا مسلک، خواہ ان کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روشنی کی حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی اس باب میں خدیل ہدایت ہے، آپ نے فرمایا:-

الناس أشبه بزمانهم من أسلافهم۔ (حافظ۔ البیان والتبيين)

لوگ، اپنے اسلاف کے مقابلہ میں، اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

دین میں اس قدر جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوتی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے زندگی میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہوگئی۔ دنیاوی اور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے)۔

جمود کی دوسری وجہ

اربابِ شریعت کے حیض اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں اپنے دائرہ اختیار میں، قوانین میں رد و بدل کرتی رہیں۔ لیکن اربابِ شریعت نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر دیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ، سابقہ زمانے کے مقابلے میں، برتر و تقویٰ ہی میں نہیں، علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔ علامہ اسلم

ماضی درخشندہ حال تاریک

دیکھا کہ مکہ کا ایک نجدی نامیائی، پکار پکار کر کہا کرتا کہ آج کی روٹی دو پیسے میں۔ کل کی (باسی) روٹی ایک آنہ میں۔ انہوں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں بیچتے ہو اور کل کی باسی ایک آنہ میں۔ کہنے لگا کہ کل کی روٹی، رسول اللہؐ کے زمانہ سے ایک دن قریب تر ہے۔ اس لئے قیمت میں گراں تر۔ یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر بھی اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اصولِ دین کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کو اپنا ماضی روکش دکھائی دیا۔ حال تاریک، اور مستقبل تاریک تر۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورت حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی وجہ، مسلمانوں کی کسی مملکت کا بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو، تو اسلام از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک، اس اسلام کا تصور کیا تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطابات، تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں

علامہ اقبالؒ کا تصور اسلام

تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ اسلامی قانونِ شریعت میں اصولی ارتقاء۔ اس میں انہوں نے کہا ہے:-

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس توازی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔۔۔۔۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شہاد کیا ہے۔۔۔۔۔ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوتی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں یونا کافی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تصور انہوں نے ۱۹۲۸-۲۹ء میں پیش کیا اور اس کے بعد، سن ۱۹۳۷ء میں، الہ آباد کے خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد رکھ دی۔ قائد اعظم نے جب اس مطالبہ کو اپنایا تو ان کے پیش نظر بھی اسلامی نظام کا یہی تصور تھا۔ میں نے قائد اعظم کے ساتھ اپنے تعلقات کا کبھی جرح یا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے (بالخصوص ان کی وفات کے بعد) خود ستائی اور نمونہ زرخیز کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن، میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس موضوع پر ان سے میری اکثر گفتگو رہتی تھی۔

قائد اعظم

(بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان سے میرے تعلقات کی بنیاد ہی یہ تھی)۔ اسلامی نظام کا یہ تصور ان کے ذہن میں بھی بالکل صاف تھا اور اس کی طرف انہوں نے کئی بار اپنی تقاریر اور بیانات میں اشارہ بھی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں، ان کا وہ بیان جو انہوں نے حیدر آباد (دکن) کے طلباء کے سوال کے جواب میں دیا تھا، ایسا واضح ہے کہ اس کی روشنی میں، اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی مملکت، جس کے لئے مطالبہ پاکستان پیش کیا جا رہا ہے، کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، فرمایا تھا:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا علی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلانہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام

ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلام حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

علامہ اقبالؒ تو حصول پاکستان سے پہلے ہی عالم بالا کو قشریعت لے گئے اور قاضی اعظمؒ یوں کہتے کہ ہنوز آئین پاکستان کی پہلی اینٹ بھی رکھتے نہ پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد، یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری ان حضرات نے اپنے ہاتھ میں لے لی، جن کے سامنے اسلام کا وہی جامہ تصویر تھا جس کی جگہ حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے پاکستان چل گیا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے، جب میٹر انکوائری کمیٹی کے سامنے حضرات علامہ کرام پیش ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں نہ قانون سازی کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجالس قانون ساز کی حاجت۔ ہمارے پاس مکمل ضابطہ قوانین بنانا یا موجود ہے۔ حکومت کا کام فقط اتنا ہے کہ اس ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ اور اگر کسی باب میں انہیں کوئی دشواری پیش آئے تو اس کی بابت ہم سے پوچھ لے۔ دوسری طرف، ادباً نظم و نسق کو اس کا احساس تھا کہ جس فقہی ضابطہ کو یہ حضرات یہاں نافذ کرانا چاہتے ہیں، وہ آج سے صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق

پاکستان میں کش مکش مرتب ہوا تھا۔ اور موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر وہ ممکن العمل نہیں رہا۔ یہ حضرات ان دشواریوں کو جانتے تھے لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کھل کر کہے کہ یہ ضابطہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود قوانین وضع کریں گے۔ چنانچہ وہ بھی اس اصطلاح کی آڑ میں اس سوال کو طے کرتے رہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گرداب جس میں مملکت کی کشتی تیس سال سے مچھنی ہوئی ہے اور حساس قلوب کی ہزار تپش و خلش کے باوجود، ایک ایسے بھی ساحلِ مراد کی طرف نہیں بڑھی۔ پھر مشکل یہ ہے کہ یہ سوال قانون سازی تک ہی محدود نہیں، قدامت پرست طبقہ کا تقاضا ہے کہ اسلاف کا اتباع زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے۔ وضع قطع، تراش خراش، رہن سہن، نشست و برخاست، خورد و نوش، حتیٰ کہ فکر و خیال تک میں ان کی عائد کردہ حدود و قیود کی پابندی لازمی ہے۔ زمانے کا سورج، ہر نئی صبح، نئی دنیا میں اپنے جلو میں لاتا ہے، لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ کسی نئی بات کے متعلق ذہن میں خیال تک لانا بھی حرام ہے۔ ان کا یہ اعلان ہر خطبہ میں، ہر خطاب و منبر میں ہر کان میں مسلسل ڈالا جاتا ہے کہ

کلّ بداعۃ صنلا لتہ۔ وکل صنلا لتہ فی الناس

ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے کا موجب۔

اور یہ ہے جدید و قدیم کی وہ کش مکش جس میں ہماری نئی نسل اس بری طرح سے گمراہ ہے۔ اس صورت حال سے کچھ ہم ہی دوچار نہیں ہوئے، دنیا کی ہر مذہب پرست قوم کو اس سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن ان کے ان اس کا علاج آسان تھا۔ انہوں نے مذہب کو گرجوں اور مندروں میں بند کیا اور زندگی کے معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل کر لی لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افراد کا ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ نہیں۔ یہ وہ نظام حیات ہے جو امت کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اور ان کی مملکت کا بنیادی آئین اور دستور ہے جو ابد الابد تک قائم و دائم رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کا تقاضا ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ڈر ہے کہ یہاں بھی وہی حالت ہو جائے گی جو یورپ (یا دیگر مذہب پرست ممالک میں ہوئی ہے۔ مذہب کو مساجد کے حجرہوں میں محبوس کر دیا جائے گا اور مملکت لادین ہو جائے گی۔ یعنی وہ وحی کے ابدی اصول و افکار کو کبھی چھوٹ دے گی۔ اور یہ ہماری ہی نہیں، نوع انسانی کی انتہائی بد قسمتی ہو گی۔

اس کش مکش کو آپ قدیم و جدید کی آدیزش یا دین اور مذہب کی کشاکش کہہ لیجئے، لیکن اس باب میں خود مذہب پرست طبقہ (قدیم) کے اندر جو باہمی کش مکش ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہاں اسلام کا اس قسم کا نقشہ قائم کرنے کی تجویز یا کوشش کی جا رہی ہے کہ پرسنل لازم کی حد تک ہر فرقہ کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہو۔ لیکن بیک لازم فقہ حنفی کے نافذ کئے جائیں کیونکہ اس فقہ کے پیروں کی یہاں اکثریت ہے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقے (سنی اور شیعہ دونوں) احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ وہ فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ (اس کی مزید تشریح میں ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا)۔

یہ وہ کش مکش جس میں یہ بد قسمت ملک اس وقت بڑی طرح الجھا ہوا ہے اور جس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو اس ملک کو تباہی سے بچانے کا احساس اور درد اپنے سینے میں رکھتا ہے تو اس کے لئے فی الواقعہ یہ گھڑی محشر کی ہے۔ اس طبقہ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ کچھ سننا پڑے گا جو امام ابو حنیفہؒ نے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سنا تھا اور جو خود مجھے تئیس (اب تیس) سال سے سننا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس طبقہ کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ اگر وہ اس خطہ پاک میں حقیقی اسلام کے احیاء

میں کامیاب ہو گئے تو پھر وہ دین، مملکت پاکستان میں ہی قائم نہیں ہوگا، اس کے عالم گیر ہوجانے کے راستے بھی ہموار ہو جائیں گے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ دین الحق، تمام ادیان عالم پر غالب آ سکتا ہے، تو اس میں الحق کی خصوصیت کا سمجھ

دین الحق کے معنی

کے مطابق قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ”کتاب و سنت“ کی روش سے کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا، جس کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق یہاں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ مذہب پرست طبقہ کے پاس اس اعتراض کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کہ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، ملحد ہے، بے دین ہے، حتیٰ کہ کافر ہے۔ تنیس برس کی مسلسل مخالفت کے بعد، جماعتِ اسلامی (جو اس مخالفت پر عصب سے آگے تھی) کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ پیگ لاز کے معاملہ میں :-

”کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔“

(ایضاً - ۲۳ اگست سنہ ۱۹۷۷ء)

لہذا، پرسنل لاز کی حد تک تو مختلف فرقوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں لیکن پیگ لاز کے لئے فقہ حنفی کو رائج کیا جائے گا جو یہاں کی اکثریت کی فقہ ہے۔ اہل حدیث فرقہ کی طرف سے اس تجویز کی پہلے ہی سخت مخالفت ہو چکی تھی۔ شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کسی فرقے کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے، اسے ہم سے، بطورِ قوانینِ شریعت، زبردستی منوایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ

”اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتناء سمجھا اور اپنے طریقہ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے ہی سہی۔“

(پمفلٹ - آئین پاکستان اور مسئلہ اسلامی فرقے - شائع کردہ

سید محمد رضا رضوی، کنوینر، ادارہ فلاح ملت پاکستان - حیدرآباد)

اگر یہاں یہ صورتحال پیدا ہوئی اور ملک خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا تو اس سے بچنے کی اس کے سوا کوئی شکل نظر نہیں آئے گی کہ یہاں سیکور نظام حکومت رائج کیا جائے۔ اور اگر یہاں سیکور نظام رائج کر دیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ مطالبہ ہوگا کہ اب پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ دو قومی نظریہ یہاں پہلے سے ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلموں کو ایک الگ قوم قرار نہیں دیا گیا اور نظام حکومت یہاں سیکور ہے۔ اس سے وہ بنیادی ختم ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور جب وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے تو اسے الگ مملکت

لے یہ اب (۱۹۷۷ء) حرم ہر چکے ہیں۔ اور جو کچھ ادھر دکھا گیا ہے وہ مسئلہ کی بات ہے۔

